محبت کرنے کے لئے کوئی عمر مقرر نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی یہ پھول لڑکپن میں ہی کھل اٹھتا ہے۔ یہ بھی ایک ایسی ہی سحر انگیز محبت کی کہانی ہے۔ اس جیتی جاگتی کہانی کا مرکزی کردار ایک ایسا نوجوان ہے جو اپنی محبت میں ہر حد سے گزر جانا چاہتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ ایک ایسی خوبرو عورت کی کہانی بھی ہے جس نے پارسائی اور گناہ کے درمیان ایک خود ساختہ حد بنا رکھی ہے۔ اپنے آپ سے اس کا وعدہ ہے کہ اس کا محبوب جب بھی یہ حد عبور کرنے کی کوشش کرے گا وہ اس سے دور چلی جائے گی..... یہ انہی گلی کوچوں کی کہانی ہے جہاں ہم اور آپ رہتے ہیں' جہاں پابند جذبوں کی کونپلیں' اکثر سماج کا سینہ پھاڑ کر نمو پاتی ہیں۔

وہ پیدائشی عاشق تھا۔ اس نے پہلی محبت صرف تین سال کی عمر میں کی تھی "بلوکی" کے نزدیک سرکاری کوارٹرز میں وہ اپنے نانا نانی اور ماں کی ساتھ رہتا تھا۔ ایک چمکیلی آنکھوں والی ننھی گڑیا سی لڑکی اس کے ساتھ کھیلا کرتی تھی۔ اس کا نام تو کچھ اور تھا لیکن حامد اسے جوجی پکارتا تھا۔ حامد کو صرف اتنا یاد ہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے پر مٹی اچھالتے تھے' پانی میں کھیلتے تھے اور کیچڑ میں لت پت ہو جاتے تھے۔ پھر جب حامد کے والد کو لاہور میں ملازمت مل گئی تو انہوں نے لاہور کے مضافات میں کرائے کا مکان لے کر حامد اور اس کی والدہ کو بلا لیا۔ لاہور آکر حامد ایک دم اداس ہو گیا تھا۔ وہ پہروں چارپائی پر لیٹا نیلے آسمان کو تکتا رہتا اور توتلی زبان میں پکارتا رہتا "گاؤں کی بہالیں تلی گئیں" (گاؤں کی بہاریں چلی گئیں) پھر کبھی کبھی وہ جوجی کا نام لیتا اور اس کا دل گہری اداسی سے بھر جاتا۔

لاہور میں حامد کو نئے ہمجولی ملے۔ نیا ماحول اور نئی مصروفیات میسر آگئیں۔ دھیرے دھیرے اس کا دل بہل گیا۔ وہ فطری طور پر شرمیلا اور کم آمیز تھا۔ اس کے سوچنے کا انداز دوسروں سے مختلف تھا۔ ہر خوب صورت چیز اس کی کمزوری تھی۔ خوبصورتی کو دیکھ کر اس کے دل میں عجیب سا حزن و ملال بھر جاتا تھا۔ وہ ایک دم اداس اور غم زدہ ہو جاتا تھا۔ اس کے اندر کی رومانیت ابھر کر سامنے آتی اور اس کے پورے وجود کو ڈھانپ لیتی۔ درحقیقت اس کے رومانی جذبوں پر انوکھے پن کی چھاپ تھی۔ اس کو انوکھا پن نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے کہ ساڑھے پانچ سال کی عمر میں اس نے دوسری اہم محبت کی........ اور یہ محبت کسی ایک فرد سے نہیں تھی' پورے ایک گروہ سے تھی۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ اس نے اپنے ہی ہم عمر قریباً چار درجن بچوں سے محبت کی........ حامد کے گھر کے سامنے

باجری کے کھیت تھے۔ کھیتوں سے آگے کھلا میدان تھا۔ یہاں اِکا دُکا نیم پختہ مکان موجود تھے۔ جہاں میدان ختم ہوتا تھا وہاں ایک اسکول کی دیوار شروع ہو جاتی تھی۔ دیوار کوئی پانچ فٹ اونچی ہو گی۔ بستی کے وہ بچے جو اسکول نہیں جاتے تھے وہ اس دیوار پر چڑھ کر بیٹھے رہتے اور اسکول کے وسیع احاطے کا نظارہ کرتے۔ حامد بھی ان بچوں میں شامل تھا (وہ اسکول کے بجائے سہ پہر کے وقت مسجد میں پڑھنے جاتا تھا) اسکول کے احاطے میں بچے "پی ٹی" کرتے تھے۔ کسی فنکشن کی تیاری ہو رہی تھی۔ رنگ برنگی وردیاں' چمکتے بوٹ' دمکتے چہرے' وہ ڈھول کی تھاپ پر ایک ساتھ پاؤں حرکت میں لاتے' ایک ساتھ جھکتے اور سیدھے کھڑے ہوتے۔ کبھی کبھی جب ٹیچر کسی کام سے اندر جاتے تو یہ شوخ وشنگ بچے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے اور اٹھکیلیاں کرتے۔ حامد کو یہ سارے ہنستے کھیلتے اور صحت مند بچے بہت اچھے لگتے تھے۔ اس کا دل اداسی اور غم سے لبریز ہو جاتا تھا۔ وہ گھنٹوں دیوار پر کسی مغموم پرندے کی طرح بیٹھا رہتا اور ان لڑکوں کو تکتا۔ وہ ان کے پاس جانا چاہتا تھا۔ ان سے باتیں کرنا چاہتا تھا' انہیں چھونا چاہتا تھا لیکن وہ سب اس سے بہت دور تھے۔ وہ ماڈل اسکول میں پڑھنے والے امیر بچے تھے' وہ آریا نگر کا رہائشی گندہ اور غریب حامد تھا۔ وہ بس انہیں دور سے دیکھ سکتا تھا۔ شاید یہی دوری تھی جو حامد کے دل میں کسک جگاتی تھی۔ وہ خوب صورت چیز سے اپنی دوری کو محسوس کر کے دن رات جلنے لگتا تھا اور اس کے عشق میں گرفتار ہوتا چلا جاتا تھا۔

اب یہ بھی کوئی بات تھی' وہ شب و روز ان چار درجن بچوں کے غم میں میں گھل رہا تھا۔ وہ ہر وقت اس کے تصور میں سمائے رہتے۔ ان کی دید کا انتظار کرتے کرتے اس کی آنکھیں پتھرانے لگتیں۔ وہ رات بھر خوابوں میں اپنے ان پیارے دوستوں کے ساتھ گھومتا۔ ان کے ساتھ کھیلتا' ان کے ہجوم میں ڈوب جاتا۔ صبح بیدار ہوتے ہی وہ جلدی جلدی ناشتا کرتا اور گھر کے سامنے والا میدان پار کر کے اسکول کی دیوار پر مغموم پرندے کی طرح بیٹھ جاتا۔

چند ہفتے یہ مشق جاری رہی' پھر اسکول کی انتظامیہ نے دیوار پر سے آریا نگر کے گندے بچوں کو بھگانا شروع کر دیا۔ چوکی دار لمبی چھڑی سے ان پر حملہ آور ہوتا اور دیوار سے نیچے اتار دیتا۔ چند روز بعد اسکول کی وہ دیوار آٹھ فٹ اونچی کر دی گئی.......... حامد جدائی کی آگ میں تپنے لگا۔ اب وہ قریبی میدان میں بیٹھ کر بس بینڈ باجے کی آواز سنتا تھا اور آنکھیں بھگوتا تھا۔

کچھ عرصہ اسی طرح بیتا پھر حامد کی بے چین فطرت نے غم کھانے کے لیے ایک اور خوبصورتی ڈھونڈلی۔ وہ اس کی ننھی منی تایا زاد بہن تھی۔ حامد بھی تو چھوٹا سا تھا۔ بمشکل آٹھ سال کا رہا ہوگا۔ حامد کی تایا زاد کا نام شمیم تھا۔ وہ اس سے ایک سال چھوٹی تھی۔ وہ گاؤں سے ان کے ہاں رہنے کے لیے آئی تھی۔ شمیم کی والدہ گاؤں کے گرلز اسکول میں ٹیچر تھیں اور وہ اس کے ساتھ تھیں۔ حامد سارا دن شمیم کے ساتھ کھیلتا۔ وہ ہاتھوں میں ہاتھ دے کر کھیتوں میں گھومتے' پگڈنڈیوں پر بھاگتے۔ مٹی کے گھروندے بناتے اور ان میں مٹی کے کھلونے رکھتے۔ شمیم اسے اچھی لگتی تھی لیکن کبھی کبھی وہ اس سے ناراض ہوجاتا اور اسے خوب پیٹتا تھا۔ ایسی مار کٹائی کے بعد وہ چند گھنٹے روٹھے رہتے مگر جلد ہی مان جاتے۔ بچپن کے کھیلوں کے نام بھی عجیب عجیب تھے۔ آنکھ مچولی' کیڑی کاڑا' روڑا چھپائی' اونچ نیچ' برف پانی اور پتا نہیں کیا کیا۔ جس کرائے کے مکان میں وہ رہتے تھے وہ اب ان کا اپنا ہو چکا تھا۔ حامد کے والد صاحب نے وسیع صحن میں ایک درمیانے سائز کا کمرا بھی بنوا لیا تھا۔ یہ دادا دادی کا کمرا تھا۔ دادا جی جب گھر سے باہر ہوتے حامد اور شمیم اس کمرے میں گھس جاتے اور پہروں ایک دوسرے کو کہانیاں سناتے۔ یہ بڑی معصوم محبت تھی۔ خالص اور شفاف اس میں کسی طرح کی ملاوٹ کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔

○-----------☆-----------○

دو تین ماہ ان کے گھر رہ کر شمیم جب چلی گئی تو حسب توقع حامد ایک بار پھر غم کے اتھاہ سمندر میں ڈوب گیا۔ بستی کے در و بام ویران ہو گئے۔ گلیوں میں زرد اداسی رینگنے لگی۔ گھر کے آنگن میں چھوٹی چھوٹی یادوں کی کرچیاں بکھر گئیں۔ یہ کرچیاں آتے جاتے حامد کے چھوٹے چھوٹے پیروں میں چبھتیں اور وہ بے چین ہو جاتا۔ وہ اس بات پر کڑھتا کہ وہ شمیم کو کیوں مارتا تھا' کیوں اس سے لڑتا جھگڑتا تھا۔ وہ اس سے معافی مانگنا چاہتا تھا۔ اور اپنی زیادتی کی تلافی کے لیے اسے ڈھیروں چیزیں کھلانا چاہتا تھا۔ آئس کریم' گول گپے' بسکٹ اور سب کچھ اپنے جیب خرچ سے لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ وہ دور جا چکی تھی اور خبر نہیں دوبارہ کب اس سے ملنا ہوتا۔

اس نے اپنے جیب خرچ میں سے کچھ پیسے اپنی والدہ کے پاس جمع کرانے شروع کر دیے ''یہ کیوں جمع کر رہے ہو حامدی؟'' والدہ نے پوچھا۔

''امی جب گرمیوں میں بھائی حسنات کی شادی پر گاؤں جائیں گے تو وہاں شمیم بھی ہو گی نا؟''

"ہاں ہوگی' کیوں نہیں ہوگی؟" حامد کی والدہ نے شلجم چھیلتے ہوئے جواب دیا تھا۔
"بس' میں ان پیسوں سے ایک بہت خوبصورت' بہت ہی خوبصورت گڑیا خریدوں گا اور اسے دوں گا۔"
"تو بڑا خبطی ہے حامدی۔" والدہ نے پیار سے اسے چپت لگائی تھی "بس کوئی نہ کوئی دھن سوار رہتی ہے تیرے سر پر۔"
"شمیم بڑی اچھی ہے نا.......... امی؟" اس نے معصومیت سے پوچھا تھا۔
"ہاں بہت اچھی ہے۔" امی نے کہا پھر ذرا توقف سے بولیں۔ "تم بڑے ہو گے تو تمہاری شادی اسی سے کر دیں گے۔"
شادی کا لفظ حامد کے لیے بے معنی تھا۔ اس نے یہ لفظ بڑی بے پروائی کے ساتھ سنا اور شلجم کے چھلکوں کو گھورتا رہا جو سردیوں کی اس سرد شام کو کچے صحن میں بکھرے پڑے تھے۔ اسے یاد آنے لگا کہ اسی جگہ ایسے ہی دو تین ہفتے پہلے بھی شلجم کے چھلکے بکھرے ہوئے تھے اور شمیم اور وہ انہیں دھو دھو کر کھا رہے تھے۔
حامد کی طبع میں مستقل مزاجی بہت تھی۔ یا شاید یہ بھی ضد یا انا ہی کی کوئی قسم تھی جو عاشقوں میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ وہ اپنے گلے میں آٹھ نو ماہ پیسے جمع کرتا رہا' یہاں تک کہ پورے ایک سو روپے ہو گئے۔ اب وہ شمیم کے لیے کوئی بہت ہی.......... بہت ہی اچھی گڑیا خرید سکتا تھا۔ بالکل ویسی' جیسی شمیم نے ایک روز پسند کی تھی۔ سردیاں بھی گزر چکی تھیں۔ بہار کے دن آنے والے تھے۔ انہیں ایک دو ہفتوں کے اندر گاؤں جانا تھا۔
لیکن پھر ہوا کا رخ حالات کو کسی اور ہی طرف لے اڑا۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ شروع ہو گئی۔ حامد کے تایا اور ان کے اہل خانہ ضلع نارووال کے ایک گاؤں مرشد پور میں رہتے تھے۔ یہ علاقہ جنگ کی زد میں تھا۔ وہ جوان رعنا جس کی شادی ہونے والی تھی' ایک اندھی گولی کا شکار ہو کر راہی عدم ہوا۔ بھاگ دوڑ کے دوران میں حامد کے تایا بھی (شمیم کے والد) شدید زخمی ہوئے۔ وہ لوگ نارووال سے فیصل آباد چلے گئے۔ یہاں دو تین ماہ بیمار رہ کر حامد کے تایا بھی انتقال کر گئے۔ پھر ایک دن معلوم ہوا کہ حامد کے سب سے بڑے تایا نصیر الدین ان کو اپنے پاس کوئٹہ لے گئے ہیں جہاں وہ سول اسپتال میں ملازم ہیں۔ حامد کے گھر والوں کے تعلقات چونکہ بڑے تایا نصیر الدین سے ٹھیک نہیں تھے اور وہ ایک دوسرے کے ہاں آتے جاتے نہیں تھے' حامد کے دل میں شمیم سے ملنے کی تمام

امیدیں دم توڑ گئیں۔ وہ مٹی کا گلہ اور اس میں جمع شدہ سو روپے اسی طرح گھر کی پرچھتی پر پڑے رہ گئے اور حامد کے دل میں غم کی گرہ سی پڑ گئی۔

دھیرے دھیرے شمیم کی معصوم شبیہہ اس کی نگاہوں میں دھندلاتی چلی گئی۔ وقت کی گرد میں یادوں کے نقش مدھم ہونے لگے۔ اور نئی مصروفیات اپنی تمام تر تازگی اور قوت کے ساتھ اسے اپنی طرف کھینچنے لگیں۔ والد صاحب کی مالی حالت اب قدرے بہتر تھی۔ وہ سرکاری نوکری کے علاوہ ایک پارٹ ٹائم جاب بھی کر رہے تھے۔ وہ خالص مذہبی ذہن کے شخص تھے۔ حامد کو دینی تعلیم دلانا چاہتے تھے لیکن حامد کا ذہن اس طرف چلتا نہیں تھا۔ وہ چھپ چھپ کر کہانیاں اور رسالے پڑھتا۔ اس نے چھت پر برساتی میں ایک قلم اور کاپی بھی چھپا رکھی تھی۔ فارغ وقت میں وہ برساتی پر پہنچ جاتا۔ یوں ہی بیٹھ کر شعر جوڑتا یا کسی خیالی ہستی کے نام بے تکے خط لکھتا۔ والد صاحب نے مایوس ہو کر حامد کو ساتویں کلاس میں داخل کرا دیا۔ اس نے اسکول میں پہنچ کر اپنے جوہر دکھائے اور ایک سال میں دو جماعتیں پاس کر کے نویں میں پہنچ گیا۔

یہ بات نہیں تھی کہ مذہب کی طرف حامد کا رجحان ہی نہیں تھا۔ وہ نماز باقاعدگی سے پڑھتا۔ جمعے کے خطبات بڑی توجہ سے سنتا اور قیامت کا خوف تو اس کے دل میں یوں جاگزیں تھا کہ تیز ہوا بھی چلتی تو وہ اس خوف سے کانپ جاتا کہ کہیں یہ قیامت کی شروعات تو نہیں۔ وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ دنیا میں تو نہیں لیکن اس کی زندگی میں واقعی ایک قیامت آنے والی ہے۔ ایک ایسا چہرہ اس کی نگاہوں میں چمکنے والا ہے۔ جو اس کے دل و دماغ کو تہ و بالا کر دے گا اور اس کی زندگی ایک نہ ختم ہونے والے طوفان کی زد میں آجائے گی۔ ہاں جیسے شکر خورے کو شکر مل جاتی ہے' ایسے ہی غم خور کو غم اور "عاشق دل" کو تڑپنے کا بہانہ مل جاتا ہے۔ حامد کو بھی یہ بہانہ مل گیا۔

وہ اپریل کے دن تھے۔ وہی بہار کا موسم جب برف پگھلتی ہے' پھول کھلتے ہیں' جب پیڑوں پر بور آتا ہے اور دلوں میں انجانے میٹھے جذبوں کی کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ حامد نویں کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ ایک روز وہ اوپر چھت پر بیٹھا پڑھ رہا تھا کہ گلی میں کسی گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ اس نے منڈیر کے جھرکوں میں سے جھانکا۔ ایک پیلی کالی ٹیکسی عبدل کے گھر کے سامنے کھڑی تھی۔ پھر ٹیکسی کے دروازے کھلے۔ اگلے دروازے سے عبدل نکلا' پچھلے دروازے سے ایک سیاہ برقع پوش وجود۔ برقع کے اندر سے دو گورے گورے ہاتھ جھانک رہے تھے۔ گورے ہاتھوں کے پیچھے کلائیاں تھیں۔ کلائیوں

میں چاندی کی چوڑیاں تھیں۔ چوڑیوں سے پیچھے سرخ چمکیلی قمیص کی آستینیں تھیں۔ یوں لگا جیسے کوئی نئی نویلی دلہن چھم سے ان کی سونی اور ویران گلی میں اتر آئی ہے۔ گورے ہاتھوں نے نقاب الٹا۔ وہ واقعی دلہن تھی۔ گلاب کا پھول' چودھویں کا چاند' خورشید تابناک یہ سارے استعارے اس چہرے کے سامنے حامد کو ہیچ محسوس ہوئے۔ وہ مسکرائی تو جیسے اس کے اردگرد کی ہر شے دمک اٹھی۔ حامد مبہوت اسے دیکھتا رہ گیا۔

عبدل کے ہاتھ میں ایک اٹیچی کیس تھا۔ اس نے ٹیکسی والے کو کرایہ دیا اور سرخ پراندے اور مہندی لگی ایڑیوں والی دلہن کے ساتھ اپنے گھر میں داخل ہو گیا۔ محلے میں جیسے ہلچل سی مچ گئی تھی۔ عورتیں اور لڑکیاں بھاگم بھاگ عبدل کے گھر پہنچ رہی تھیں۔ وہ اس کی دلہن دیکھنا چاہ رہی تھیں۔ حامد کے گھر سے بھی اس کی والدہ اور دادی دلہن دیکھنے کے لیے لپک کر گئیں۔ شام تک یہ ہنگامہ جاری رہا۔ عبدل راج گیری کرتا تھا۔ عمر قریباً چوبیس سال رہی ہوگی۔ وہ ہر لحاظ سے ایک معمولی شخص تھا۔ ایک معمولی گھر میں اپنے معمولی اہل خانہ کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کی تعلیم بھی معمولی تھی' یعنی صرف پرائمری پاس۔ پہلے وہ معماروں کے پیچھے ٹوکری ڈھوتا تھا۔ پھر کسی نہ کسی طرح اس نے اینٹیں لگانا سیکھ لیا۔ اب وہ پچاس روپے............ دہاڑی کماتا تھا اور اس معمولی کمائی کے ساتھ معمولی دال روٹی کھا کر سو رہتا تھا۔ والدہ کے سوا اس کا دنیا میں اور کوئی نہیں تھا۔ یہی سبب تھا کہ گزر بسر ہو رہی تھی۔ پچھلے کچھ عرصے سے عبدل کی شادی کا چرچا تھا۔ ایک مہینہ پہلے معلوم ہوا تھا کہ عبدل کی منگنی مریدکے میں اپنے کسی رشتے دار کے ہاں ہو گئی ہے۔ مریدکے میں عبدل کا بڑا بھائی رہتا تھا۔ پروگرام کے مطابق عبدل کو اپنے بڑے بھائی کے گھر سے برات لے کر دلہن لینے جانا تھا اور یہ شادی وہیں پر انجام پانا تھی۔ یہ سب کچھ سن کر حامد کو یقین نہیں آیا تھا کہ عبدل جیسے شخص کی شادی بھی ہو سکتی ہے۔ وہ دیکھنے میں ہی گاؤدی نظر آتا تھا۔ اوپر سے جسمانی ساخت بھی اس کی تمام دوسری صفات کی طرح معمولی تھی۔ کوتاہ قد' منحنی جسم' سانولا رنگ اور آگے کو جھکے ہوئے کندھے' جیسے اپنے معمولی ہونے کے سبب خود ہی شرمسار ہوں۔ عبدل کا سر پچکا ہوا تھا اور پیشانی چوڑائی میں بہت چھوٹی نظر آتی تھی۔ حامد نے کئی بار سوچا تھا' شاید ٹوکری اٹھا اٹھا کر اس کا سر واقعی پچک چکا ہے "ایسے کچلے ہوئے سر والے کو دلہن کون دے گا؟" وہ سوچتا۔

پھر اس نے خیال کیا تھا' شاید عبدل کی دلہن بھی اسی کی طرح بس ایویں ہوگی لیکن آج اس کے سارے اندازے غلط ثابت ہو گئے تھے۔ عبدل الف سے ے تک

معمولی تھا مگر اس کی دلہن معمولی نہیں تھی۔

چند دن تک تو حامد کو عبدل کی دلہن دکھائی نہیں دی پھر ایک دن وہ یوں "چھن" سے اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی' جیسے گھپ اندھیرے میں ایک دم ہزار پاور کا بلب جل اٹھے۔ حامد برساتی میں بیٹھا تھا اور علامہ اقبال کی نظم شکوہ کی تشریح کر رہا تھا۔ دروازے سے اس کی والدہ اور دادی کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ اپنے کام میں مصروف رہا۔ اچانک اسے محسوس ہوا کہ دادی اور والدہ دروازے پر کھڑی ہیں' ان کے ساتھ کوئی اور بھی موجود ہے اور وہ سب اسی کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ اس نے سر اٹھایا تو اس کے سامنے ہزار پاور کا قمقمہ روشن تھا۔ وہ سبز ریشمی جھلملاتے سوٹ میں تھی اور اس سبزے میں اس کا چہرہ گلابی پھول کی طرح دمک رہا تھا۔ والدہ بولیں "یہ ہماری برساتی ہے اور یہ ہے میرا بیٹا حامد۔ کل میں نے تم سے اسی کا ذکر کیا تھا۔"

"السلام علیکم۔" دلہن نے دلنشین تبسم کے ساتھ کہا۔

ایک گولا سا حامد کے گلے میں اٹک گیا۔ اس نے بھی جواباً السلام علیکم ہی کہا لیکن آواز اتنی پھنسی ہوئی تھی کہ خبر نہیں کسی کے کان تک پہنچی یا نہیں۔ دلہن کے ہونٹوں سے ہنسی کا ایک آبشار چھوٹا اور حامد جیسے بھیگتا چلا گیا۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھ کر بے تکلفی سے حامد کے سر پر ہاتھ رکھا اور بالوں کو بکھیر دیا "بڑا پیارا بچہ ہے۔" اس نے کہا۔

"اور شرمیلا بھی۔" حامد کی والدہ نے لقمہ دیا۔

حامد کچھ اور شرما گیا۔

"کس کلاس میں پڑھتے ہو؟" دلہن کی آواز نے اس کے کانوں میں جلترنگ بجائے۔

"نائینتھ میں۔" حامد نے سنبھل کر کہا۔

"ماشاء اللہ" دلہن بولی اور پھر حامد کی والدہ کے ساتھ باتیں کرتی باہر نکل گئی۔

حامد کتنی ہی دیر اپنی جگہ ساکت و جامد بیٹھا رہا۔ اس کے بالوں میں جیسے ابھی تک پانچ حنائی انگلیاں رینگ رہی تھیں۔ چاندی کی چوڑیوں کی چھن چھن اس کے کانوں میں تھی اور ایک دیوانی خوشبو اس کے دل و دماغ میں سرایت کرتی چلی جا رہی تھی۔ اس نے نظم "شکوہ" کی طرف دیکھا۔ لیکن "نظم" کتاب کے صفحے پر سے صاف غائب ہو چکی تھی۔ وہاں ایک دلنشین متبسم چہرہ چمک رہا تھا۔ یہ عبدل کی دلہن کا چہرہ تھا۔

عبدل کی دلہن نے محلے میں بڑی تیزی اور سرعت کے ساتھ جگہ بنائی۔ اس کا

نام فرخندہ تھا۔ وہ میٹرک پاس تھی۔ والد "مرید کے" میں لے ستارے کا کام کرتے تھے۔ پتا نہیں عبدل کی قسمت میں کیسی چمک تھی کہ اس گاوُدی کو فرخندہ جیسی دلہن مل گئی تھی۔ یا پھر یہ شاید ان........ مجبوریوں کا شاخسانہ تھا جو بیٹیوں کے سلسلے میں غریب اور متوسط گھرانوں کا مقدر ہوتی ہیں۔ بہرحال اب یہ ایک حقیقت تھی کہ اونچی لمبی' خوب رو اور ذہین فرخندہ کوتاہ قد' سانولے اور گاوُدی عبدل کی بیوی تھی۔ ان دونوں کی عمروں میں کچھ زیادہ فرق نہیں تھا بلکہ ذہانت اور متانت کے اعتبار سے دیکھا جاتا تو فرخندہ شوہر سے بڑی ہی دکھائی دیتی تھی۔ وہ ایک خوش اخلاق' ہنس مکھ اور ہمدرد لڑکی تھی۔ اس کے کردار کی سب سے اہم صفت یہ تھی کہ وہ ہر کسی کی بات بڑے غور سے دھیان سے سنتی تھی اور بات کرنے والے کے غم یا خوشی میں شریک ہو جاتی تھی۔

یہی وجہ تھی کہ وہ آناً فاناً محلے بھر کی عورتوں میں مقبول ہو گئی تھی۔ کسی دانا کا یہ قول سچ ثابت ہو رہا تھا کہ زیادہ سننے والے اور کم بولنے والے کی پذیرائی ہر محفل میں ہوتی ہے۔

عبدل کا گھر حامد کے گھر کے بالکل سامنے واقع تھا۔ فرخندہ اکثر حامد کے گھر بھی آجاتی تھی۔ حامد کی والدہ سے اس کی گاڑھی چھننے لگی تھی۔ محلے کی اکثر عورتیں حامد کی والدہ کو آپا کہتی تھیں' فرخندہ بھی بڑی اپنائیت سے آپا کہنے لگی تھی۔ وہ گھنٹوں ان کے ساتھ باتیں کرتی اور جب ان کے پاس بیٹھی ہوتی تو یوں لگتا جیسے وہ بھی کوئی بڑی بوڑھی ہے لیکن کچھ ہی دیر بعد جب وہ اپنے گھر کے آنگن میں عبدل کے ساتھ باتیں کرتی نظر آتی تو اس کے انگ انگ سے شباب اور شوخی کے سوتے پھوٹتے محسوس ہوتے۔ ان دونوں کو باتوں میں محو پا کر نجانے کیوں حامد کا سینہ سلگنے لگتا۔ اسے عبدل کی قسمت پر رشک آتا اور اس کے ساتھ ساتھ ایک عجیب سی اداسی اس کے دل میں بھری جاتی۔ اسے یوں لگتا جیسے وہ ہاؤل اسکول کی دیوار پر بیٹھا ہے اور بے وجہ بے سبب غم کے سمندر میں غرق ہوتا جا رہا ہے۔

ان دنوں برسات شروع ہونے والی تھی۔ جن مکانوں کی چھتیں کچی تھیں وہ مٹی وغیرہ ڈال رہے تھے اور لیپ کر رہے تھے۔ عبدل کے گھر کی چھت پر بھی لیپ ہونے والا تھا۔ فرخندہ نے [illegible] اپنے ذمے لے لیا تھا۔ ایک روز حامد نے اپنی چھت پر سے ان کے آنگن میں جھانکا' تو وہ کمر سے دوپٹا باندھے کمربستہ نظر آئی۔ صحن میں کسی اور کڑاہیاں وغیرہ نظر آ رہی تھیں اور مٹی کو بھگو کر "دگانی" کی جا رہی تھی۔ محلے کی دو تین جوان

لڑکیاں بھی رضاکارانہ طور پر فرخندہ کا ساتھ دے رہی تھیں۔ آخر وہ بھی تو اسی طرح دوسروں کے کام آتی تھی۔ چھت پر لیپ کرنے کا کام بڑے خوش گوار ماحول میں جاری تھا۔ ساتھ ساتھ ہنسی مذاق بھی چل رہا تھا۔ حامد بڑی محویت سے یہ منظر دیکھنے لگا۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ وہ بڑی محویت سے فرخندہ کو دیکھنے لگا۔ جب فرخندہ سامنے ہوتی تو تو وہ صرف فرخندہ کو ہی دیکھتا تھا۔ ایک عجیب سی خود فراموشی اس پر طاری ہو جاتی تھی.......... اس کی نظر مستقل فرخندہ کا تعاقب کر رہی تھی۔ وہ جھکتی تو نظر بھی جھک جاتی' وہ اٹھتی تو نظر بھی اٹھتی' وہ مسکراتی تو حامد کی نظر بھی مسکرانے لگتی۔ اپنی اس کیفیت کا اسے خود بھی علم نہیں تھا۔ پختہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ایک لڑکی کا پاؤں پھسلا اور کڑاہی اس کی سر پر ڈول گئی۔ پتلا پتلا گارا پیچھے آتی فرخندہ پر الٹ گیا "ہائے تیرا بیڑا غرق سکینہ۔" فرخندہ چیخی اور اپنے سر اور چہرے سے گارا پونچھنے لگی۔

حامد کے حلق سے بے اختیار ہنسی کا فوراہ ابل پڑا۔ لڑکیوں نے چونک کر اوپر منڈیر کی طرف دیکھا۔ سکینہ نے چیخ کر کہا "اوئے حامدی' تو یہاں کھڑا کیا دیکھ رہا ہے؟"

ثریا بولی "لگتا ہے کسی کو تاڑ رہا ہے۔"

سکینہ بولی "تجھی کو تاڑ رہا ہوں گا۔ ہم تو بھئی شادی شدہ ہیں۔"

"مجھے تو لگتا ہے کسی شادی شدہ کو ہی تاڑ رہا ہے۔" ثریا نے جواب دیا۔

"تو پھر ضرور فرخندہ کو تاڑتا ہو گا۔" سکینہ نے لقمہ دیا۔

"مجھے کیوں تاڑے گا۔ میرا تو چھوٹا سا منا سا بھائی ہے۔" فرخندہ نے بلند آواز میں کہا پھر حامد سے مخاطب ہو کر بولی "اے حامدی! سچ بتا مجھے تو نہیں دیکھ رہا تا؟"

حامد کا چہرہ شرم سے سرخ ہو چکا تھا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی۔ وہ بڑبڑا کر جلدی سے پیچھے ہٹ گیا اور چارپائی پر آبیٹھا۔ قریباً چار فٹ اونچی پختہ منڈیر کے اندر چھوٹے چھوٹے مستطیل رخنے موجود تھے۔ وہ چارپائی پر بیٹھ کر بھی ان رخنوں میں سے فرخندہ کے آنگن کا منظر دیکھ سکتا تھا۔ فرخندہ اور دونوں لڑکیاں ہنس رہی تھیں۔ حامد نے خود کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اب کسی اور بات پر ہنس رہی ہیں۔ فرخندہ کا سر' چہرہ اور گریبان کیچڑ میں لتھڑ گیا تھا۔ اس نے بالٹی میں ڈونگا ڈبویا اور کھڑے کھڑے اپنا منہ سر دھونے لگی۔ سر اور چہرے سے کیچڑ صاف ہو گئی۔ اندر سے دھلا دھلایا سفید گلاب نکل آیا۔ بالائی جسم دھونے کی کوشش میں اس کے سارے کپڑے بھیگ چکے تھے۔ حامد کے لیے یہ نظارہ اور دلکش ہو گیا۔ بھیگے لباس کے ساتھ سیڑھیاں

چڑھتی اور اترتی ہوئی فرخندہ اسے بہت اچھی لگی۔ بالکل جل پری' جس کا جسم نیلی جھیل میں تیرتے کنول کی طرح ڈولتا تھا۔ تاہم حامد کے ان محسوسات میں کسی طرح کی بداخلاقی کو دخل نہیں تھا۔ وہ بس اسے خوب صورت لگ رہی تھی۔ بالکل جیسے جو.جی اچھی لگتی تھی۔ ماڈل اسکول کے بچے اچھے لگتے تھے۔ اس کی محبت میں محبت کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ بالکل خالص محبت تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ لڑکیوں کی فقرے بازی کا غصہ بھول کر پھر منڈیر پر جا کھڑا ہوا۔ وہ بھی اب قدرے سنجیدہ نظر آتی تھیں۔ فرخندہ نے ناز سے کہا "اے حامدی! تھوڑا سا کام تو کر دے ہمارا۔"

"کیا کرنا ہے؟" اس نے بظاہر بے پروائی سے کہا۔

اندر سے اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ فرخندہ نے پہلی بار اسے کسی کام کے لے کہا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا وہ سرتاپا اطاعت بن جائے اور اگر وہ اسے دنیا کے آخری کونے تک بھی بھیجے تو سرپٹ بھاگتا چلا جائے۔

فرخندہ بولی "ہائے ہائے' ذرا نیچے تو آ۔ ہم تجھے کھا تو نہیں جائیں گے۔"

سب کھلکھلا کر ہنس دیں "اچھا آتا ہوں۔" حامد نے کہا۔

اس نے اپنی دھڑکنیں سمیٹیں۔ زینے اترا اور گلی پار کر کے فرخندہ کے آنگن میں پہنچ گیا۔ فرخندہ نے اوڑھنی کے پلو سے چند روپے کھول کر اس کے ہاتھ میں تھمائے "حامدی! ذرا چوک تک جانا ہو گا۔ حاجی کی دکان سے چار کلو سفیدی اور ایک کوچی لے آؤ۔"

"اور تھوڑا سا نیل بھی۔" سکینہ نے لقمہ دیا۔

"کیا کرو گی اتنی سفیدی؟" حامد نے پوچھا۔

"بھئی ہمارا پروگرام بنا ہے کہ لگے ہاتھ کمروں میں سفیدی چونا اور رنگ و روغن بھی کر ڈالیں۔" فرخندہ نے جواب دیا۔

"یہ سب کچھ تم خود کرو گی؟"

"تو اور کیا نوکر کریں گے۔ اپنا گھر ہے۔ اپنا کام خود کرنے میں کیا حرج ہے۔" وہ بولی۔

اس نے جس اپنائیت سے "اپنا گھر" کہا تھا وہ حامد کو کچھ اچھا نہیں لگا۔ اس کے دل میں پھر عبدل اور اس کے گھر کے بارے میں حسد جاگ اٹھا۔ بہرطور اس نے روپے

تھامے اور بھاگم بھاگ بازار پہنچ کر مطلوبہ سامان لے آیا۔

ایک بڑے ٹب میں سفیدی بھگو دی گئی۔ سفیدی کو رات بھر بھیگنا تھا۔ فرخندہ لڑکیوں کے ساتھ مل کر کمروں کا مختصر سامان برآمدوں میں رکھنے لگی.......... کرسیاں' میز' بستر' برتن' کپڑے۔ غیر ارادی طور پر حامد بھی ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔ اسے یہ سب کچھ بہت........ بہت دلچسپ محسوس ہو رہا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا یہ مصروفیت کبھی ختم نہ ہو۔ سامان اسی طرح کمروں سے نکل نکل کر برآمدے میں ڈھیر ہوتا رہے۔ فرخندہ کی مخصوص مہک بار بار اس کے قریب آتی رہے اور دور جاتی رہے لیکن وہ کیا۔ غریب گھر کا سامان تھا۔ کتنی دیر کمروں سے نکلتا رہتا۔ جلدی ختم ہو گیا اور حامد کو برے دل کے ساتھ گھر لوٹنا پڑا۔

گزرنے والے ہر دن کے ساتھ فرخندہ میں حامد کی دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ زیادہ سے زیادہ وقت اس کے پاس گزارنے کی کوشش کرتا۔ بھاگ بھاگ کر اس کے کام کرتا۔ کبھی وہ اس کے گھر چلا جاتا' کبھی وہ ان کے گھر آجاتی۔ وہ نویں کلاس میں پڑھتا تھا اور فرخندہ دسویں کر چکی تھی لیکن حامد میں ایک خاص قسم کا ادبی ذوق موجود تھا اور اس ذوق کی موجودگی میں وہ خود کو فرخندہ سے زیادہ تعلیم یافتہ اور لائق سمجھتا تھا۔ اکثر وہ شعر جوڑتا تھا۔ اس کے شعر ویسے ہی ہوتے جیسے نویں' دسویں کلاس کے اردو کورسز میں ہوتے ہیں۔ وہ اپنے یہ شعر فرخندہ کو دکھاتا اور اس پر اپنی علمی دھاک بٹھانے کی کوشش کرتا۔ فرخندہ ناک چڑھا کر کہتی "حامد! تیرے شعر بڑے روکھے پھیکے ہوتے ہیں۔" پھر ایک دم پینترا بدلتی۔ "ویسے ٹھیک ہی ہے۔ چھوٹی عمر میں ایسے ہی اچھے اچھے شعر لکھنے چاہئیں' خراب شعر لکھنے کو تو ابھی عمر پڑی ہے۔"

حامد کو یہ بات بڑی بری لگتی تھی' اسے فرخندہ کی ہر وہ بات بری لگتی تھی جو اسے یہ احساس دلاتی کہ وہ بچہ ہے' معصوم ہے' ننھا منا ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ فرخندہ اسے ننھا منا سمجھے۔ وہ ایک دم ناراض نظر آنے لگتا۔ فرخندہ فوراً کانوں کو ہاتھ لگاتی "اچھا علامہ صاحب! میری توبہ' مجھے معاف کیجئے۔ اب آپ کے شعروں کو روکھا پھیکا نہیں کہوں گی۔"

اس کا انداز حامد کو بے ساختہ مسکرانے پر مجبور کر دیتا۔ ایسے میں حامد کی والدہ کہتیں "فرخندہ! یہ تو بالکل عاشق ہے تیرے اوپر۔ مجھے پہلے پتا ہوتا تو عبدل کی جگہ اسے تیرا دلہا بناتی۔"

فرخندہ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتی۔ حامد غصے سے ماں کی طرف دیکھتا "امی' کیا

الٹی سیدھی باتیں کرتی ہیں آپ۔"

"اور تم جو الٹی سیدھی کرتے ہو۔" امی کہتیں "ہر وقت اسی کے پاس گھسے رہتے ہو۔ میرے چاند' اب ماشاء اللہ جوان ہو تم اور جوان مرد عورتوں کے پاس نہیں بیٹھتے۔"

"ہائے آپا' آپ بھی کیا کرتی ہیں۔" فرخندہ کہتی "یہ جوان ہے؟ یہ تو ہمارا ننھا سا بلونگڑا ہے۔"

ایسے خطابات پر حامد کا موڈ ایک بار پھر بگڑ جاتا۔ حامد کی والدہ اور فرخندہ لگاتار ہنسنے لگتیں۔

ایک ایسے ہی موقع پر عبدل کھنکھارتا اندر آگیا۔ اسے دیکھ کر فرخند سنجیدہ ہو گئی اور اس نے سر اوڑھنی کے پلو سے ڈھانپ لیا۔ عبدل نے اپنے پیلے پیلے دانت نکالے اور بولا "فرخندہ جی! تم یہاں ہو' میں تمہیں پورے گھر میں ڈھونڈ رہا تھا۔"

"پھوپا بشیر آیا ہے کراچی سے۔ وہاں اس نے ایک بڑی کوٹھی کا ٹھیکا لیا ہے۔"

"تو کیا یہی خوش خبری سنانے آیا ہے؟" فرخندہ نے پوچھا۔

"نہیں اور بات بھی ہے۔ چل گھر آ بتاتا ہوں تجھے۔"

"اچھا تو چل' میں بھی آتی ہوں" فرخندہ نے شوہر سے کہا۔

"ذرا جلدی آنا فرخندہ جی۔ پھوپا کو چائے پانی بھی پوچھنا ہے۔"

"اچھا............ اچھا۔" فرخندہ نے قدرے بے زاری سے کہا۔

اس کی بے زاری محسوس کر کے عبدل جلدی سے اٹھ گیا۔ جیسے وہ کوئی غلام ہو اور اسے اپنی ملکہ کی خفگی کا ڈر ہو۔ فرخندہ کے سامنے وہ ایسے ہی دبا دبا اور گھٹا گھٹا رہتا تھا۔ فرخندہ ہر اعتبار سے عبدل پر فوقیت رکھتی تھی اور اس کی یہی فوقیت غالباً عبدل کو احساس کمتری میں مبتلا کر چکی تھی' ورنہ فرخندہ کی طرف سے تو کبھی کوئی ایسی بات نہیں ہوئی تھی۔ وہ حتی الامکان اس کی عزت کرتی تھی بلکہ اتنی عزت کرتی تھی کہ عبدل کو ہضم ہی نہیں ہو پاتی تھی اور عبدل کے ساتھ ساتھ شاید حامد کو بھی ہضم نہیں ہوتی تھی۔ وہ عبدل جیسے گاؤدی کی یہ عزت افزائی دیکھ کر جل کڑھ جاتا اور نجانے کیوں شدید حسد محسوس کرنے لگتا۔

اس شام عبدل نے فرخندہ سے کیا خاص بات کہی تھی' اس کا انکشاف تیسرے روز سہ پہر کو ہوا۔ حامد پر یہ خبر بجلی بن کر گری کہ عبدل اور اس کی بیوی فرخندہ کراچی جا رہے ہیں اور اب کچھ عرصہ وہیں رہیں گے۔ دراصل عبدل کا پھوپا اسے لینے کے لیے ہی

لاہور آیا تھا۔ اس نے کراچی میں کسی رہائشی عمارت کا ٹھیکا لیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کوئی قابل اعتماد کارندہ اس کے پاس ہو' جو تعمیر کا کام بھی کرے اور دیگر مزدوروں کے کام کی نگرانی بھی کرے۔ اس سلسلے میں اس کی نگاہ کرم اپنے رشتے دار عبدل پر پڑی تھی۔ اب وہ مفت رہائش اور خوراک کی یقین دہانی پر اسے اپنے ساتھ لے جارہا تھا۔ ظاہر ہے فرخندہ کو بھی ساتھ جانا تھا۔

حامد یہ خبر سن کر جلدی سے چھت پر گیا اور منڈیر کے جھروکوں میں سے فرخندہ کے گھر جھانکنے لگا۔ وہاں چارپائی پر ایک تنومند شخص بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ اس کی مونچھیں گھنی اور کلف زدہ تھیں۔ یہی عبدل کا پھوپا تھا۔ نجانے کیوں یہ شخص حامد کو اچھا نہیں لگا تھا۔ عبدل اپنے مچھیل پھوپا کے پاس ہی زمین پر بیٹھا تھا اور ایک سوٹ کیس بند کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ فرخندہ اندر برآمدے میں تھی اور ضروری سامان باندھ رہی تھی۔ حامد کے دل میں ہوک سی اٹھی۔ وہ ایک ٹک فرخندہ کو دیکھتا چلا گیا۔ ماں کی آواز نے اسے چونکایا۔ وہ نجانے کب اس کے پیچھے آکر کھڑی ہو گئی تھیں۔ "حامد! جا بیٹا' جا کر مل آ عبدل اور فرخندہ سے۔ وہ جا رہے ہیں۔"

"مجھے کیا ضرورت پڑی ہے۔" وہ جل کر بولا تھا۔

"اچھا چل' فرخندہ سے مل آ۔"

"میں کیوں جاؤں؟"

"ہائے ہائے' اتنا پیار کرتی ہے تجھ سے۔ اب جا رہی ہے۔ پتا نہیں کب آئے گی۔ اسے خدا حافظ تو کہہ آ۔"

"جا وہ رہی ہے۔ میں تو نہیں جا رہا۔ وہ خود خدا حافظ کہنے آجائے۔"

"بگلے' آئی تھی وہ .... تو غسل خانے میں گھسا ہوا تھا' بیٹھ کر چلی گئی۔ کہتی تھی حامد کو بھیجنا۔"

"میں نہیں جاتا۔" اس نے کھٹاک سے کہا اور نیچے اتر گیا۔ نہ صرف نیچے اترا بلکہ ڈیوڑھی طے کر کے دروازے پر آیا اور باہر نکل گیا۔ جب وہ گلی کے آخری سرے پر پہنچا تو اس نے ایک تانگا دیکھا۔ وہ فرخندہ کے گھر کے سامنے رک رہا تھا۔

حامد چلتا رہا اور بستی سے باہر نکل آیا۔ بستی سے آگے کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ کھیتوں سے آگے جامن اور امرود کا چھوٹا سا باغ تھا۔ بڑی ٹھنڈی چھاؤں تھی۔ وہ باغ کے گھنے درختوں کے نیچے بیٹھ گیا اور شاخوں کی اوٹ سے اس راستے کو دیکھنے لگا جو

بستی سے نکل کر وسطی شہر کی طرف جاتا تھا۔ آدھ پون گھنٹے بعد اسے وہ تانگا نظر آیا جو عبدل اور فرخندہ کو اسٹیشن کی طرف لے جا رہا تھا۔ اس نے دور سے دیکھنے کی کوشش کی۔ اسے صرف فرخندہ کی سبز اوڑھنی نظر آئی۔ وہ عبدل کے پہلو میں بیٹھی تھی۔ ساتھ عبدل کی ماں بھی تھی۔ اگلی سیٹ پر کوچوان کے ساتھ مچھیل پھوپا براجمان تھا۔ حامد تانگے کو دیکھتا رہا یہاں تک کہ وہ اس کی نظر سے اوجھل ہو گیا۔ حامد کی آنکھوں سے لگاتار آنسو بہنے لگے۔ وہ بلک بلک کر رونے لگا۔ وہ خود نہیں جانتا تھا کہ وہ کیوں رو رہا ہے۔

اندھیرا گہرا ہونے پر وہ گھر واپس لوٹا تو عبدل کے مکان کو تالا لگا ہوا تھا۔ حامد گھر میں داخل ہوا تو ہر شے ویران اور سونی نظر آئی۔ باورچی خانے کی زرد روشنی میں اس کی والدہ روٹی پکا رہی تھیں۔ والد کمرے میں بیٹھے صبح کا باسی اخبار دیکھ رہے تھے۔ دادی اماں نماز کے بعد وظیفہ پڑھ رہی تھیں۔ حامد نے کھنکار کر اپنی واپسی کا اعلان کیا اور پھر سیدھا اوپر برساتی میں چلا گیا۔

○-------☆-------○

فرخندہ کے جاتے ہی آریا نگر ایک دم ویران ہو گیا تھا۔ حامد پہروں چھت پر لیٹا رہتا اور اس سنسان آنگن کو دیکھتا جہاں فرخندہ کا رنگین آنچل لہراتا تھا اور اس کی کھنکتی آواز گونجتی تھی۔ اس آنگن میں اب اداسی کی زرد دھول پھیلی تھی۔ اور تنہائی مکڑی کے جالوں کی طرح لٹک رہی تھی۔ وہ انگور کی بیل جسے فرخندہ روز اپنے ہاتھ سے پانی دیتی تھی، کملائی ہوئی تھی۔ فرخندہ کی ایک ایک بات حامد کو یاد آتی اور اس کی آنکھیں نم ہو جاتیں۔ وہ بڑے درد کے ساتھ سوچتا۔ کیا فرخندہ بھی اسے یاد کرتی ہے۔ کیا وہ بھی اس کے بارے میں سوچتی ہے۔ کبھی کبھی اسے افسوس ہونے لگتا کہ اس نے جاتے وقت فرخندہ اور عبدل کو الوداع کیوں نہیں کہا تھا۔ آخر اسے کیا ناراضگی تھی عبدل اور فرخندہ سے اور خاص طور سے فرخندہ نے اس کا کیا بگاڑا تھا۔ وہ اپنے شوہر کے کہنے پر اس کے ساتھ گئی تھی۔ اس نے کیا جرم کیا تھا لیکن جلد ہی غم و غصہ پھر اس پر غالب آجاتا۔ نجانے کیوں اس کے ذہن میں بے معنی شکوے چیخنے چلانے لگتے۔ یہاں سے جانے کے بعد عبدل اور فرخندہ کی کوئی خیر خبر نہیں تھی۔ ٹیلی فون کا تو خیر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کوئی خط پتر بھی نہیں تھا۔

کوئی دس روز بعد جب ایک روز حامد اسکول سے واپس آیا تو اس نے دیکھا کہ فرخندہ کے گھر کا مقفل رہنے والا دروازہ کھلا ہے اور اندر کوئی گھوم پھر رہا ہے۔ مسرت کی ایک

بلند لہراس کے سینے سے اٹھی اور پورے جسم کو سنسنا گئی "تو کیا فرخندہ واپس آگئی ہے؟"
اس نے بے چین ہو کر سوچا اور دروازے کی طرف لپکا۔ جوں ہی وہ اندر داخل ہوا' اس کی نگاہ عبدل پر پڑی۔ وہ انگور کی بیل کے پاس کھڑا تھا۔ اس کے قریب حامد کی والدہ اور محلے کی دو تین دوسری عورتیں بھی موجود تھیں۔ وہ سب باتیں کر رہے تھے۔ حامد کی نظر برق کی طرح گھر کے طول و عرض میں لہرا گئی۔ اسے فرخندہ کہیں نظر نہیں آئی۔

حامد کی والدہ نے کہا "لو حامد بھی آگیا۔"

"السلام علیکم۔" حامد نے ٹھٹھرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"وعلیکم السلام علیکم ورحمتہ اللہ حامد باؤ۔" عبدل نے اپنے مخصوص انداز میں دانت نکالے "اور سناؤ کیا حال شال ہے۔ امتحان کب شروع ہو رہا ہے تمہارا؟"

"بس ہونے ہی والا ہے۔" حامد نے مرے مرے لہجے میں کہا۔ "اور......... تم......... سناؤ اکیلے ہی آئے ہو؟"

"ہاں باؤ یار۔ کچھ ضروری سامان رہ گیا تھا وہ لینے آیا ہوں۔ دراصل وہاں کام کچھ لمبا ہو گیا ہے نا......... پھوپے بشیر کو دو کوٹھیوں کا ٹھیکہ اور مل گیا ہے۔ لگتا ہے کہ یہ سردیاں تو ہمیں کراچی میں ہی گزارنا پڑیں گی۔"

حامد کی آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاریاں سی اڑنے لگی تھیں۔ اس نے خود کو بڑی مشکل سے سنبھالا۔ کندھے پر بستہ اسے منوں وزنی محسوس ہونے لگا تھا۔ اس نے بستہ اتار کر آہستگی سے چارپائی پر رکھ دیا۔ محلے والیاں عبدل سے باتوں میں مصروف تھیں۔ وہی کراچی کی باتیں۔ کام کاج کی باتیں۔ روز افزوں مہنگائی اور محدود آمدن کی باتیں۔ حامد بڑے دھیان سے یہ باتیں سنتا رہا اور منتظر رہا کہ ان باتوں میں کہیں فرخندہ کا ذکر بھی آئے اور اسے فرخندہ کا حال احوال معلوم ہو لیکن یوں لگتا تھا کہ یہ ذکر اس کے آنے سے پہلے ہی ہو چکا ہے۔ وہ مایوس سا ہونے لگا اور اس کا جی چاہا کہ اٹھ کر چل دے اور عبدل کو خدا حافظ کہے بغیر بیرونی دروازے سے نکل جائے لیکن عین اسی وقت عبدل کی آواز نے اس کے قدم تھام لیے۔ وہ بولا "حامد باؤ! فرخندہ تو بڑا یاد کرتی ہے تجھے۔ ہر وقت تیری باتیں کرتی رہتی ہے۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ بھی میرے ساتھ ہی یہاں کا ایک چکر لگا جائے مگر وہاں ماں کے پاس بھی تو کسی کو رہنا تھا نا۔"

حامد کے سینے میں انجانی مسرت کے ہزاروں شادیانے بج اٹھے۔ اس کے کان کچھ

اور سننے کے لئے یوں بے تاب ہو گئے جیسے غوطہ خور ایک طویل کٹھن غوطے کے بعد سانس لینے کے لیے بے تاب ہو جاتا ہے۔

حامد کی والدہ نے پوچھا۔ "وہ ٹھیک ٹھاک تو ہے نا عبدل؟"

"اب تو ٹھیک ہے' بس پچھلے دنوں کچھ بیمار ہو گئی تھی۔ پتا نہیں کیا تھا۔ گم صم پڑی رہتی تھی۔ دس بارہ روز دوائی کھائی۔ دوائی سے تو ٹھیک نہیں ہوئی لیکن جب دوائی چھوڑ دی تو بھلی چنگی ہو گئی۔"

حامد کے سینے میں گونجتے ہوئے شادیانیوں کی آواز فلک شگاف ہو گئی۔ اس کے جسم میں انبساط کی انجانی لہریں دوڑنے لگیں۔ نجانے وہ کب عبدل کے گھر سے نکلا اور کب اپنے گھر کے زینے طے کر کے برساتی میں پہنچ گیا۔ اس کے کانوں میں بار بار عبدل کے الفاظ گونج رہے تھے "بس پچھلے دنوں کچھ بیمار ہو گئی تھی۔ پتا نہیں کیا تھا۔ گم صم پڑی رہتی تھی............ پتا نہیں کیا تھا۔" نجانے کیوں حامد کا دل گواہی دینے لگا کہ فرخندہ بھی اسے یاد کرتی ہے۔ اس کے گم صم رہنے کی وجہ وہ خود تھا............ وہ خود تھا۔

اگلے روز عبدل واپس چلا گیا۔ فرخندہ کے گھر کا آنگن پھر ویران تر ہو گیا لیکن حامد کے لئے اس ویرانی میں اب ایک پہلو اطمینان کا بھی تھا۔ فرخندہ کے لیے اس کا بے معنی غم و غصہ اب دور ہو چکا تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ جیسے وہ فرخندہ سے محبت کرتا ہے' فرخندہ بھی اس سے کرتی ہے۔ انہی دنوں اس کی نگاہ الماری میں مٹی کے اس گلے پر پڑی جو چھ سات برسوں سے جوں کا توں رکھا تھا۔ ایک مرتبہ حامد نے اس گلے میں سو روپے جمع کیے تھے۔ ان روپوؤں سے وہ اپنی تایا زاد شمیم کو کوئی تحفہ دینا چاہتا تھا۔ اب وہ تحفہ لینے والی کہیں دور جا چکی تھی۔ اس کی یاد بھی مٹتے مٹتے حامد کے ذہن سے مٹ چکی تھی لیکن یہ گلہ اسی طرح الماری میں پڑا تھا۔ حامد نے تایا زاد شمیم کے بارے میں سوچا اور اسے وہ کوئی اجنبی لڑکی محسوس ہوئی' جس کے لیے اس نے بے کار میں سنہری تاروں سے خواب بنے تھے۔ اسے اپنے آپ پر افسوس ہونے لگا کہ وہ شمیم کے بارے میں ایسی دیوانگی سے کیوں سوچا کرتا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ گلے میں مزید رقم جمع کرے گا اور تب تک جمع کرتا رہے گا جب تک سردیاں گزر نہیں جاتیں اور فرخندہ واپس لاہور آ نہیں جاتی اور جب وہ واپس آجائے گی تو وہ اسے کوئی بہت اچھا............ بہت اچھا سا تحفہ پیش کرے گا۔ ایسا تحفہ جو حامد کی محبت ہی کی طرح قیمتی اور یادگار ہو گا۔ اس نے برسوں بعد ایک بار پھر گلے میں رقم جوڑنا شروع کر دی۔ ساتھ ساتھ وہ منصوبے بھی بناتا رہا کہ

فرخندہ کو کیا تحفہ دے گا۔ کبھی وہ سونے کے جھمکوں کے بارے میں سوچتا۔ کبھی کسی بہت خوب صورت گھڑی کے بارے میں۔ کبھی کسی طلائی چین کے بارے میں جو حامد کی پرخلوص محبت کی نشانی بن کر ہمیشہ فرخندہ کے سینے سے لگی رہتی۔

انہی دنوں حامد کے میٹرک کے امتحان شروع ہو گئے۔ دو ڈھائی ماہ کے لیے وہ کتابوں میں کھو سا گیا۔ فرخندہ کے تصور کے سامنے اس نے ہاتھ باندھ کر اسے خود سے دور کھڑا کر دیا تھا.......... لیکن جوں ہی امتحانات ختم ہوئے' یہ تصور ایک بار پھر پوری شدت سے اس پر حملہ آور ہو گیا۔ اس مرتبہ اس تصور میں ایک نئی کیفیت تھی۔ ایسی کیفیت جو حامد نے اس سے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ اس سے پہلے حامد کی محبت کا تعلق تین حواس سے تھا۔ یعنی دیکھنا' سننا اور سونگھنا۔ وہ فرخندہ کو دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کی شیریں آواز سننا چاہتا تھا اور اس مہک میں کھویا رہنا چاہتا تھا جو اس کے جسم اور اس کی ذات سے پھوٹتی تھی لیکن اب حامد کی محبت حواس خمسہ کی محبت بنتی جا رہی تھی۔ یعنی چھونے اور چکھنے کی حسیں بھی اس میں شامل ہو رہی تھیں۔ اس کا دل چاہتا جب فرخندہ واپس آ جائے اور تنہائی میں اس کے قریب بیٹھے اور یہ کہے کہ وہ اسے بہت یاد کرتی رہی ہے اور اس کی آنکھوں میں پیار کا سمندر کروٹ لیتا نظر آئے تو وہ اسے چھو لے۔ بڑی آہستگی اور بڑی ملائمت کے ساتھ' پھر اسے چھو کر وہ یوں ہی بیٹھا رہے۔' دیر تک' مدتوں تک' صدیوں تک۔ نہ اسے اپنے پاس سے اٹھنے کی اجازت دے۔ نہ خود اس کے پاس سے اٹھ کر کہیں جائے۔ ساری دنیا جن میں عبدل بھی شامل ہو' چیخ چیخ کر فرخندہ کو بلاتی رہے۔ لیکن فرخندہ یوں ہی بت بنی اس کے پاس بیٹھی رہے۔

عید کا چند عید سے پہلے نظر آتا ہے لیکن اس بار یہ چاند عید سے دو روز بعد نظر آیا تھا۔ یہ چاند دراصل وہ خط تھا جو کراچی سے فرخندہ کی سہیلی سکینہ کے نام آیا تھا۔ یہ فرخندہ کا خط تھا اور اس خط میں اس نے اطلاع دی تھی کہ وہ اور اس کا میاں جمعے کے روز کراچی ایکسپریس سے لاہور واپس پہنچ رہے ہیں۔ حامد پر شادی مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ اس نے ایک دھماکے سے مٹی کا وہ گلہ پھوڑا تھا جس میں قریباً پانچ سو روپے جمع ہو چکے تھے۔ کالج سے واپس آتے ہوئے وہ "سوہا بازار۔" کی طرف چلا گیا تھا اور وہاں سے اس نے ایک نہایت نفیس چھوٹا سا طلائی لاکٹ خریدا تھا۔ اس میں چھوٹے چھوٹے نگینے لگے ہوئے تھے۔

جمعے کے روز حامد کی حالت دیدنی تھی۔ وہ صبح سے چھت پر بیٹھا تھا اور اس

راستے پر نظریں جمائے ہوئے تھا جو وسطی شہر سے آریا نگر کی طرف آتا تھا۔ سہ پہر کے وقت اس کی بنجر آنکھیں اپنے محبوب چہرے کی دید سے سیراب ہو گئیں۔ ایک ٹیکسی کے ذریعے فرخندہ اپنے میاں اور ساس سمیت بستی میں پہنچ گئی۔ اس نے بڑے دھیان سے فرخندہ کو دیکھا۔ وہ کچھ بھی تو نہیں بدلی تھی۔ وہی لپک، وہی طمطراق وہی دل میں کھب جانے والی آنکھیں۔ محلے والیاں اس کے گرد گھیرا ڈال کر کھڑی ہو گئیں۔ اس کے مداحوں میں لڑکیاں ہی نہیں بڑی بوڑھیاں بھی تھیں اور یہی فرخندہ کی خوبی تھی۔

"ہائے ری، اتنی دیر کہاں رہی؟"

"اف اللہ! کتنی دبلی ہو گئی ہو۔"

"اور سناؤ کوئی بال بچہ ہوا یا نہیں۔"

"اب واپس جانے کا ارادہ تو نہیں؟"

اس طرح کے فقرے حامد کے کانوں میں پڑ رہے تھے۔ اب وہ اپنے دروازے پر کھڑا شرمایا شرمایا سا اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر فرخندہ کی نگاہ اس پر پڑی۔ حامد کا خیال تھا کہ وہ لپک کر اس کی طرف آئے گی۔ سب کچھ بھول بھال کر اس کی طرف متوجہ ہو جائے گی لیکن اس کی اچٹتی سی نگاہ نے حامد کو مایوس کر دیا۔ اپنے میاں اور محلے والیوں کے ساتھ وہ صحن میں داخل ہو گئی۔ پیچھے پیچھے حامد بھی چلا گیا۔ یہاں فرخندہ نے ایک بار پھر اسے دیکھا اور مسکرا کر حال چال پوچھا۔ حامد نے مختصر جواب دیا۔ اسے فرخندہ کی آنکھوں میں اپنے لیے کوئی خصوصی اہمیت نظر نہیں آئی تھی۔ وہ کچھ دیر ٹھہر کر گھر واپس آگیا۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد اس کی والدہ فرخندہ کے گھر سے واپس آئیں تو ان کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔

بولیں "یہ دیکھ رے حامدی! فرخندہ تیرے لیے کتنا پیارا تحفہ لائی ہے۔"

حامد نے بے تابی سے لفافہ کھول کر دیکھا۔ اس میں ایک بڑے سائز کی خوب صورت لوڈو تھی۔ لوڈو کے تمام مہرے اسٹیل کے بنے ہوئے تھے اور ان پر بلوری ہیڈ تھے۔

"کیسی ہے؟" والدہ نے پوچھا۔

"اچھی ہے۔" حامد نے مختصر جواب دیا اور چھت پر اپنی پناہ گاہ یعنی برساتی میں چلا آیا۔

برساتی کا دروازہ بند کر کے وہ دھم سے بستر پر گر پڑا۔ اسے فرخندہ کے مبہم رویے سے اتنی کوفت نہیں ہوئی تھی جتنی اس تحفے سے ہوئی تھی۔ اسے لگا جیسے وہ کہہ

رہی ہے "یہ لو میرے ننھے سے بلونگڑے! اپنا کھلونا لو اور چھت پر جا کر کھیلو۔"

تو کیا میں اس کی نظر میں ابھی تک ایک بچہ ہوں؟ لوڈو سے بہل جانے والا۔ اسے بے زاری سے لوڈو ایک طرف رکھ دی اور بتی جلا کر خود کو کتابوں میں غرق کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

.... فرخندہ کو آئے دو روز ہو چکے تھے لیکن وہ ایک بار چند منٹ کے سوا ان کے گھر نہیں آئی تھی۔ آنگن میں بھی وہ صرف دو تین بار نظر آئی تھی اور ہر دفعہ جلدی میں دکھائی دیتی تھی۔ حامد کو یوں لگا جیسے وہ بدل چکی ہے یا پھر شروع سے ہی وہ غلط اندازے لگاتا رہا ہے۔ فرخندہ کو اس سے کوئی خاص لگاؤ تھا ہی نہیں۔ جیسے وہ دوسروں سے ہنس کر بات کرتی ہے اس سے بھی کرتی تھی۔ یقیناً یہی بات تھی۔ کم از کم وہ ایک بار تو حامد کو بلاتی یا خود آ کر اس سے ملتی۔ اس کے ذہن میں بار بار گھنی مونچھوں والے پھوپا بشیر کا خیال بھی آتا تھا۔ نجانے کیوں پھوپا بشیر کے حوالے سے اس کے ذہن میں انجانے اندیشے پروان چڑھ رہے تھے۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ جہاں دیدہ اور زمانہ ساز پھوپا بشیر نے کراچی میں فرخندہ کے ساتھ کوئی تعلق............ بنا لیا ہو۔ یہ ایک بے معنی سا رقیبانہ خیال تھا لیکن وہ اسے اپنے ذہن سے جھٹک نہیں پا رہا تھا............ اس روز شام تک حامد کی مایوسی اپنے عروج کو پہنچ گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جمع ہو گئے اور گلے میں پھندا سا لگ گیا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھا۔ اس نے وہ لوڈو اٹھائی جو فرخندہ نے تحفے میں بھیجی تھی اور کسی بپھرے ہوئے جانور کی طرح اس نے لوڈو کے ٹکڑے کر دیے۔ پھر اپنے تکیے کے غلاف میں سے اس نے وہ چھوٹی سی سرخ ڈبیا نکالی جس میں جڑاؤ لاکٹ پڑا تھا۔ وہ کچھ دیر تذبذب کے عالم میں اس لاکٹ کو دیکھتا رہا پھر اس نے لاکٹ زمین پر پٹخ دیا اور چارپائی کے ایک ٹوٹے ہوئے پائے سے ضربیں لگا لگا کر اس کی شکل بگاڑ دی۔ جب وہ بالکل چرمر ہو گیا تو اسے کاٹھ کباڑ کے پیچھے پھینک دیا۔ اس کے بعد وہ چارپائی پر اوندھا گر گیا اور سسکنے لگا۔ یہی وقت تھا جب سیڑھیوں پر مدہم چاپ سنائی دی پھر ماں کی آواز آئی۔ "ہاں اوپر ہی ہے۔" وہ کسی سے کہہ رہی تھی۔

اونچی ایڑی کی ٹھک ٹھک گونجی۔ حامد کا دل سینے میں اچھل گیا۔ یہ فرخندہ کے قدموں کی چاپ تھی۔ اس نے دروازہ کھولا اور اندر آ گئی۔

"اوہو۔" تو جناب یہاں چھپے بیٹھے ہیں۔" وہ چہک کر بولی۔ حامد بے سدھ رہا "بنو مت لاٹ صاحب! مجھے پتا ہے تم سو نہیں رہے۔"

پھر وہ دھم سے اس کے پاس چارپائی پر بیٹھ گئی۔ اس کی جانی پہچانی خوش بو حامد کے نتھنوں میں گھسنے لگی۔ اس کے ہاتھوں نے حامد کا شانہ جھنجوڑا۔ اس کے جسم میں برق لہرائی مگر وہ بے حرکت پڑا رہا۔ "بڑے ایکٹر ہو بھئی۔ ندیم اور وحید مراد وغیرہ تو کوئی شے ہی نہیں۔" اس نے کہا۔

چند لمحے بعد حامد کو اپنے کان میں سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا' وہ حامد ہی کے بال پوائنٹ سے اس کے کان میں گدگدی کر رہی تھی۔ حامد نے یک دم اس کی کلائی تھام لی اور غصے سے بازو دور ہٹا دیا۔

"ہائے ہائے کیا ہے۔ کیوں روٹھے ہوئے ہو؟" وہ ذرا چمک کر بولی "اتنے دنوں بعد آئی ہوں اور ٹھیک سے سلام تک نہیں کیا تم نے۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟"

"مجھے کچھ نہیں ہوا۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔" حامد گلوگیر آواز میں بولا۔

"اگر یہ ٹھیک ہے تو پھر خراب کسے کہتے ہیں۔" اس نے حامد کی پسلیوں میں انگلی چبھوئی۔ تب اس کی نگاہ لوڈو کے ان پھٹے ہوئے ٹکڑوں پر پڑی جو حامد نے چارپائی کے نیچے پھینک دیے تھے۔ وہ ایک دم گم صم سی ہو گئی۔ اس نے نیچے جھک کر وہ ٹکڑے اٹھائے اور خاموشی سے حامد کی طرف دیکھنے لگی۔ حامد آنکھوں پر بازو رکھے چت لیٹا تھا۔

"بہت ناراض لگتے ہو تم تو۔" وہ بدلے ہوئے لہجے میں بولی۔ "کیا غلطی ہو گئی ہے مجھ سے۔"

"غلطی مجھ سے ہوئی ہے۔" وہ [illegible] بولا۔

یوں لگا جیسے کمرے کی فضا ایک دم بے حد سنجیدہ ہو گئی ہے اور وہ بات حامد کی نوک زبان پر آنے والی ہے جو کسی وقت اسے بے حد......... بے حد مشکل محسوس ہوتی تھی۔ اس ایک لمحے کو فرخندہ نے حیران کن تیزی سے سنبھالا۔ اس سے پہلے کہ حامد کچھ بولتا' اس نے بات پلٹ دی "اچھا بھئی' مانا کہ تم ہی سے غلطی ہوئی ہے۔ اگر غلطی ہوئی ہے تو پھر معافی مانگو۔ چلو اٹھو شاباش' چلو اٹھو۔"

وہ اسے گدگدانے لگی۔ اس کے پہلو' اس کی بغلیں' اس کی گردن' فرخندہ کی انگلیوں کی زد میں تھے لیکن ہنسی اس کے ہونٹوں سے کوسوں دور تھی۔ فرخندہ کتنی ہی دیر اسے ہنسانے اور منانے کی کوشش کرتی رہی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ اسی دوران میں عبدل اپنے گھر کے صحن سے فرخندہ کو آوازیں دینے لگا۔

"بڑے ڈھیٹ ہو تم۔" وہ مصنوعی غصے سے دانت پیس کر بولی اور اس کے سر

کے بالوں کو زور سے جھٹک کر باہر نکل گئی۔

اگلے روز شام کو آٹھ بجے کے لگ بھگ وہ پھر برساتی میں آگئی۔ اس مرتبہ وہ براہ راست چھت سے آئی تھی۔ دونوں مکانوں کی درمیانی گلی بہت تنگ تھی۔ مکانوں کے شیڈ ایسے آگے کی طرف بڑھے ہوئے تھے کہ گلی پر چھت سی پڑ گئی تھی۔ بس ڈیڑھ دو فٹ کا خلا باقی تھا۔ اس کو پھلانگنا قطعاً مشکل نہیں تھا۔ فرخندہ بھی اس خلا کو پھلانگ کر آئی تھی۔ اس روز بھی وہ آدھ پون گھنٹے تک اس سے سر کھپاتی رہی اور پوچھتی رہی کہ آخر کیا بات ہے جو وہ اس سے ناراض ہوا پڑا ہے۔ حامد اس روز بھی ٹس سے مس نہیں ہوا۔ وہ اس کے ساتھ کھینچا تانی کر کے سرخ ہو رہی تھی اور ہانپی ہوئی تھی۔ نو بجنے والے تھے اور حامد کے ابو کے گھر آنے کا وقت ہو چلا تھا۔ وہ تھکے ہارے لہجے میں بولی "اچھا تمہارا دماغ ٹھیک کرنے کے لیے میں کل پھر آؤں گی اور اسو قت تک آتی رہوں گی جب تک تمہارا دماغ ٹھیک نہ ہو جائے۔"

"تم نے میرا دماغ ٹھیک کرنے کا ٹھیکا لے رکھا ہے؟"

"ٹھیکا نہیں۔ بس یہ ضد ہے میری۔"

"تم ہار جاؤ گی۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

"کیسے؟"

"مجھے یقین ہے کہ کل تم نہیں آؤ گی۔"

"کیوں نہیں آؤں گی۔ اتنی کم ہمت نہیں ہوں میں۔"

"میں دعویٰ کرتا ہوں کہ کل تم نہیں آؤ گی۔" وہ ڈرامائی لہجے میں بولا۔

"لیکن کیوں۔" وہ ٹھنک کر اس کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

ایک میکانکی حرکت کے تحت حامد نے اپنا ہاتھ جیب میں ڈالا اور ایک تہ شدہ کاغذ فرخندہ کو تھما دیا "یہ کیا ہے؟" وہ حیرت سے بولی۔

"پڑھ لینا۔" اس نے کہا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

"حامدی.......... حامدی!" وہ اسے پکارتی رہ گئی لیکن وہ بگولے کی طرح سیڑھیاں اتر کر باہر گلی میں آگیا اور پھر بستی سے باہر نکل کر چلڈرن پارک میں جا بیٹھا۔

اس کے دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ آج وہ بات اس نے تحریر کی زبانی فرخندہ تک پہنچا دی تھی جسے کہنے کے لیے وہ طویل عرصے سے مچل رہا تھا۔ شاید صدیوں سے، شاید زمانوں سے۔ اس نے سب اندیشے بالائے طاق رکھ کر اپنے اس مختصر خط میں

لکھ دیا تھا "میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ یہ کسی بچے کی محبت نہیں۔ یہ ویسی محبت ہے جیسی ایک عورت سے ایک مرد کرتا ہے۔ تم کو معلوم نہیں میں اپنی محبت میں کتنا آگے جا چکا ہوں۔ میں دن رات' سوتے جاگتے ہر وقت صرف اور صرف تمہارے بارے میں ہی سوچتا ہوں۔

حامد۔"

ایک بہت بڑا......... بوجھ حامد کے سینے سے اتر گیا تھا اور اسے سکون محسوس ہو رہا تھا۔ لیکن اس سکون میں ایک بے سکونی بھی پنہاں تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ فرخندہ کا رد عمل کیا ہو گا۔ ممکن تھا کہ وہ آگ بگولا ہو جاتی اور اپنے خاوند عبدل کو سب کچھ بتا دیتی۔ یا پھر وہ یہ خط حامد کی والدہ کے سامنے رکھ دیتی اور ان سے کہتی کہ وہ اپنے بیٹے کو سنبھالیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ کسی سے ذکر نہ کرتی لیکن اس خط کے ٹکڑے کر دیتی اور آئندہ حامد اور اس کے اہل خانہ سے ناتا توڑ لیتی۔ جوں جوں حامد اس بارے میں سوچ رہا تھا' اس کے اندر ایک احساس گناہ نمو پا رہا تھا۔ یہاں تک کہ یہ خیال اس کے ذہن کو ڈسنے لگا کہ اس نے جلد بازی میں ایک غلط اور شرم ناک قدم اٹھالیا ہے۔

وہ کافی دیر تک چلڈرن پارک میں بیٹھا رہا۔ جب پارک خالی ہو گیا اور اردگرد کے مکانوں کی بتیاں بجھنے لگیں تو وہ اٹھا اور مختلف گلیوں سے گزر کر خاموشی سے اپنے محلے میں داخل ہو گیا۔ اس نے بڑے ڈرے سہمے انداز میں اپنے گھر کا دروازہ کھولا۔ اسے لگ رہا تھا کہ والد صاحب ہاتھ میں جوتا لیے صحن کے بیچوں بیچ بیٹھے ہوں گے اور اندر داخل ہوتے ہی اس پر پل پڑیں گے۔ یہ دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی کہ صحن خالی تھا اور والد صاحب کے کمرے کی بتی بھی بجھی ہوئی تھی۔ والدہ برآمدے میں بیٹھی ایک پڑوسن سے باتیں کر رہی تھیں۔ حامد نے بغور والدہ اور پڑوسن کے چہروں کا جائزہ لیا۔ وہاں کسی قسم کے خطرات نظر نہیں آئے۔ وہ کچھ دیر صحن میں گھومنے پھرنے کے بعد اپنے کمرے میں چلا گیا۔

اگلے تین روز عجیب تذبذب میں گزرے۔ ماحول پر ایک گھمبیر سناٹا طاری تھا۔ فرخندہ ان کے گھر میں داخل ہوئی تھی اور نہ اپنے ہی آنگن میں اس کی صورت دکھائی دی تھی۔ پتا نہیں کہاں گم تھی وہ؟ تیسرے دن حامد نے اسے دیکھا۔ وہ گلی میں کھڑی ایک خوانچے والے سے باتیں کر رہی تھی۔ اس کی سہیلی سکینہ بھی پاس ہی موجود تھی۔ فرخندہ نے حامد کو دیکھا لیکن نظرانداز کر دیا جیسے دیکھ کر بھی نہ دیکھا ہو۔ حامد پاس سے گزرنے لگا

تو سکینہ بولی۔ ”اے حامدی! آج کل بڑے نخرے ہیں تیرے۔ کسی چھوٹے موٹے سے بات ہی نہیں کرتا۔ کالج میں داخل ہو گیا ہے نا۔“

حامد جواب دیے بغیر آگے بڑھ گیا۔ سکینہ نے فرخندہ کو بیچ میں گھسیٹنے کی کوشش کی ”دیکھ رہی ہے فرخندہ۔ بات کا جواب بھی نہیں دیتا۔“

”تو بات بھی تو شرارت کی کرتی ہے۔“ فرخندہ کی مدہم آواز ابھری۔

شاید کچھ اور بھی کہا گیا ہو لیکن حامد اپنے گھر میں داخل ہو چکا تھا۔

○------------- ☆ -------------○